رسائل و مسائل

چند معاشیاتی حقیقتیں

ایک صاحب نے اپنے مفصل خط میں چند ایسی الجھنیں پیش کی ہیں جو نظامِ معاشی کی اصلاح میں فرد اور حکومت کی ذمہ داریوں میں فرق نہ کرنے اور احکامِ شریعت اور خلفائے راشدین کے طریق کار کو پوری تفصیل سے نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ ان غلط فہمیوں کے متعلق اندازہ یہ ہے کہ ان کا اثر کم و بیش ہمارے دینی طبقے اور ہمارے جدید تعلیمیافتہ طبقے کے اکثر افراد میں پایا جاتا ہے پس مختصر جواب پر اکتفا کرنے کے بجائے ضروری امور کی پوری طرح وضاحت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ (ادارہ)

۱۔ کسی ملک میں جب بپیمانۂ کبیر معاشی ناہمواریوں کو فروغ حاصل ہو چکا ہو اور زندگی کی ساری سہولتیں طبقۂ امراء نے اپنے لیے سمیٹ لی ہوں تو متوسط طبقے اور غریب طبقے کے کروڑوں افراد کی معاشی گتھیوں کو سلجھانا کوئی آسان کام نہیں رہتا۔

بلاشبہ حساس اور خدا ترس افراد پر اپنے گرد و پیش کی مفلوک الحال آبادی کے بارے میں بڑی بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، لیکن افراد محض اپنی انفرادی حیثیت سے ان مصائب کا خاتمہ کر ہی نہیں سکتے جن کو پیدا کرنے اور جن کو نشو و نما دینے کی ذمہ داری نظامِ حکومت پر عاید ہوتی ہو۔ چند افراد اگر انسانی اخوت و ہمدردی کے جذبہ سے انتہائی حد تک بھی سرشار ہو جائیں تو بھی وہ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتے ہیں وہ اتنا ہی تو ہے کہ وہ اپنا گھر بار لٹا کر خود کو انتہائی فلاکت زدہ طبقہ میں شامل کر دیں، اور ڈوبتوں کو سہارا دیتے ہوئے خود بھی ڈوبنے والوں میں شامل ہو جائیں، لیکن ایسے معاشرہ میں چند آدمیوں کا اپنے آپ کو ہمہ تن لٹا دینا بھی معاشی ناہمواریوں کا خاتمہ نہیں کر سکتا

اصلاح کا اصل کام اُس اجتماعی قوت کا ہاتھ پکڑ کر اُسے عدل پر مجبور کر دینا ہے جو ہر بگاڑ کی اصل ذمہ دار ہوتی ہے۔

اصلاح پسند قوتوں کی اصل توجہ ایک نظامِ معاشی کے عنان برداروں پر منعطف ہوتی ہے۔ اور وہ دولت کے بٹوارے کے اُس مرکزی انتظام کو پوری اہمیت کے ساتھ پیشِ نظر رکھتے ہیں جس کے تحت اربابِ اقتدار ایک ہاتھ سے اپنے شہریوں سے محاصل وصول کرتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے وہ جمع شدہ خزانے کو ان پر ایک خاص تناسب سے صرف کرتے ہیں۔ وصول و صرف کا یہ مرکزی نظام اگر نادرست ہو تو اگر کچھ بے نفس لوگ رضاکارانہ طور پر اپنی جائدادیں عوام میں لٹا ڈالیں تو اس سے ناہمواریوں کا خاتمہ نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ جب اشتراکی فکر اپنے ابتدائی دورِ ظہور میں تھی تو اس کے اصولوں پر ایمان لانے والے کچھ افراد نے فرانس میں یہ کوشش کی تھی کہ وہ نظامِ حکومت کو بدلے بغیر محض اپنے طور پر کارخانہ داری کو نئے اصولوں پر ڈھال لیں۔ اور مزدوروں کو ان کے تمام جائز حقوق بہم پہنچا دیں۔ لیکن یہ تجربات قوت و دولت کے صرفِ کثیر کے بعد ناکام ہو گئے۔ اور پھر اشتراکی تحریک نظامِ حکومت میں انقلاب لانے کے لئے پوری یکسوئی سے صف آرا ہو گئی۔ بالکل اسی طرح اگر معاشرے کی قیادت اور حکومت کا نظام غیر اسلامی نہج پر چل رہا ہو تو انفرادی فرد فرداً اس کے مفاسد کے آگے بند باندھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

دراصل فرد کے ذمے والدین، اہل و عیال، ذوی القربیٰ، یتیمی و مساکین، مسافروں اور قیدیوں اور پڑوسیوں کے بارے میں جو معاشی ذمہ داریاں عاید کی گئی ہیں ان کا دائرہ اثر محدود ہے۔ اور وہ سب صحیح معنوں میں اگر نتیجہ خیز ہو سکتی ہیں تو صرف ایک اسلامی معاشرے ہی میں ہو سکتی ہیں۔ انفرادی انفاق تو اسلامی اسٹیٹ کے رفاہِ عام کے نظام کے ان رخنوں کو پُر کرنے کے لئے ہے جو بہر حال کسی نہ کسی پہلو سے چھوٹ جاتے ہیں۔ لیکن یہ انفرادی انفاق اسٹیٹ کی غلط ناانصافیوں کا ازالہ کرنے کے لئے کبھی کافی نہیں ہو سکتا۔

پس اصل جدوجہد نظامِ حکومت اور معاشرہ کے ماحول اور تقسیمِ دولت کے اصولوں کی

اصلاح کے لئے صرف ہونی چاہیئے۔ اور انفرادی انفاق کا بہت بڑا حصہ اسی جدوجہد کو تقویت بہم پہنچانے کے لئے مخصوص ہونا چاہئے۔

۲۔ انسان کی طبعی ضروریات بنیادی طور پہ بہت ہی محدود ہیں۔ اسے پیٹ بھرنے کو ساگ پات، کچا غلہ یا آٹا اور پینے کو پانی مل جائے تو زندگی کی بنیادی ضروریات یہی ہیں۔ ان سے آگے بڑھیں تو وہ پتوں سے، کھالوں سے یا کسی کپڑے کے چیتھڑے سے بدن کے ضروری حصوں کو ڈھانک سکتا ہے۔ اور آگے چلیں تو اس کی رہائش کے لئے کوئی غار، کوئی جھونپڑی، کوئی کٹیا فراہم ہونے کی ضرورت قابلِ تسلیم نظر آتی ہے۔

لیکن حیوان اور انسان میں فرق یہی ہے کہ اول الذکر صرف ضرورت کو پورا کرنے پر اکتفا کرتا ہے لیکن آخر الذکر کے اندر ذوقِ جمال بھی ہے، حسیات لطیف بھی ہیں، اس کے دیکھنے، سونگھنے، چکھنے اور لمس کرنے کی قوتیں بھلے اور برے کی تمیز کرنے میں بہت ہی زیادہ حساس ہیں۔ ان وجوہ سے وہ ضروریات کی حدود کو مسلسل وسیع کرتا چلا جا رہا ہے اور ان ضروریات کو پورا کرنے کے طور طریقوں میں ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔

پس "ضرورت" کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی میں ایک دوسرا پہلو بھی پایا جاتا ہے جسے قرآن "زینت" کا نام دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

یٰبَنِیٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ وَّکُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ۝ (پ ۸ ع ۱۱)	اے اولادِ آدم! تمام نمازوں میں (شرکت کرتے ہوئے) اپنی زیبائش کا اہتمام کر لیا کرو۔ اور (نہیں حق ہے کہ) کھاؤ اور پیو، لیکن اسراف نہ کرو۔ بلاشبہ وہ (اللہ) مسرفین کو نہیں چاہتا۔

پھر رہبانیت کے تصورات کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ	اے نبیؐ! ان سے کہیئے کہ اللہ کی (جائز کردہ) دلچسپیوں اور غذا کی ان پاکیزہ اقسام کو حرام

ھی للذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا خالصۃً یوم القیٰمۃ کذٰلک نفصل الاٰیٰت لقوم یعلمون ۝

(پ ۸ ع ۱۱)

کرنے والا کون ہے جو خود (اللہ ہی) نے اپنے بندوں کے لئے بہم پہنچائے ہیں؟ — کہہ دیجئے کہ اس دنیوی زندگی میں ایمان لانے والوں ہی کا جائز حق ان پر ہے (اگرچہ کفار کو بھی استفادہ کرنے کی ڈھیل دے دی گئی ہے) اور آخرۃ میں تو یہ صرف انہیں کے لئے مخصوص ہونگی۔ یوں ہم کھول کھول کے اپنے احکام کو واضح کرتے ہیں، ان لوگوں کے لئے جو سمجھتے بوجھتے ہیں!

پھر واضح فرمایا کہ اصل میں حرام ہے کیا؟ :-

قل انما حرم ربی الفواحش ما ظھر منھا وما بطن والاثم والبغی بغیر الحق وان تشرکوا باللہ ما لم ینزل بہ سلطٰنا وان تقولوا علی اللہ ما لا تعلمون ۝

(پ ۸ ع ۱۱)

اے نبیؐ! اعلان کر دیجئے کہ میرے رب نے تو اگر حرام کیا ہے تو صرف بے حیائیوں کو، چاہے وہ کھلی ہوں یا چھپی، اور نافرمانی کو، اور کسی کے اوپر کسی وجہ جواز کے بغیر زیادتی کرنے کو اور پھر اس بات کو کہ اس کے ساتھ تم کسی کو شریک ٹھہراؤ جسکے بارے میں خود اللہ نے کوئی سند نہیں اتاری اور یا پھر اس بات کو کہ اللہ کے ذمے وہ بات لگاؤ جس کے بارے میں تم کوئی علم نہیں رکھتے۔

دراصل اس سارے سلسلۂ کلام کا محور اگرچہ دوسرا ہے، لیکن اس کے ذریعے غلط مذہبی روایات کے تحت پیدا ہونے والے ایک خطرناک رجحان کا سدباب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عام طور پر خداپرستی جب بھی خدا کی ہدایت سے آزاد ہوتی ہے تو اس میں ترک دنیا اور بالخصوص ترک

زینت کا رہبانی انداز پیدا ہوتا رہا ہے۔ یہ وہ خطرناک بلا ہے جو تمدن کی ترقی کے سامنے روک بن کے کھڑی ہو جاتی ہے، حالانکہ دینِ فطرت تمدنی ارتقاء کو روکنے کے لئے نہیں آیا، بلکہ اسے ایک صحیح راستے پر موڑ کر اس کی رفتار کو تیز سے تیز تر کرنے آیا ہے۔ اسلام کے ظہور سے قبل عرب کی مذہبی ذہنیت کو عین یہی روگ لگ چکا تھا، چنانچہ وہ لوگ جب بیت اللہ کا طواف کرتے تھے تو لباس سے آزاد ہو جایا کرتے تھے، کیونکہ لباس ان کو ایک پر تکلف سامانِ زینت محسوس ہوتا ہے جو خدا پرستی کے تقاضوں کو پورا کرنے میں حائل ہوتا تھا۔ خدا کے حضور جاتے ہوئے وہ تمدن و تہذیب کے لوازم کی ساری کینچلیاں اتار کے جاتے تھے اور اس کے بغیر ان کے نزدیک معراج عبادت کا حصول ممکن ہی نہ تھا۔

لیکن جب ان کے سامنے تحریک اسلامی نمودار ہوتی اور اس کے کارکنوں نے ان رہبانی تصورات کی بیخ کنی کر دی اور نہ صرف طواف کے لئے بلکہ تمام عبادات میں زیادہ سے زیادہ خوشنما لباس کے ساتھ اپنے آپ کو خدا کے حضور میں پیش کرنا شروع کیا تو ان پر طنز کیا جاتا تھا کہ واہ! یہ خوب خدا پرستی ہے کہ صفائی ستھرائی، سلیقہ، آرائش وغیرہ قسم کی ساری آلودگیاں ساتھ لگی ہوتی ہیں۔ اس قسم کی فضا میں ان آیات کا نزول ہوا اور ان سے غلط مذہبی تصورات کی بیخ کنی مطلوب تھی۔

اس سارے سلسلۂ کلام کا آغاز آدم و حوا کی داستان سے ہوتا ہے۔ جو اپنی فطرت کے تقاضوں سے مجبور ہوتے کہ اپنا بدن ڈھانپیں۔ اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے لباس کے دو مقاصد بیان فرمائے ہیں:۔

یٰبَنِیٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا	اے اولادِ آدم! ہم نے تمہارے لئے پوشاک فراہم کی تاکہ وہ تمہاری ستر پوشی بھی کرے اور تمہارے لئے آرائش و زینت کا سامان بھی ہو۔
(پ۸ - ع۲)	

یہاں بہت خوبی سے واضح کر دیا گیا ہے لباس کا ایک پہلو ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ اور اس

میں دوسرا قابل لحاظ پہلو زینت و آرائش کا ہے، بلکہ کہنا یہ چاہیئے کہ انسانی فطرت کے تقاضوں کو مدّنظر رکھا جائے تو جائز حد تک زینت و آرائش خود ایک ضرورت ہے، اگرچہ بنیادی نہیں۔

لباس ہی کی طرح کھانے میں بھی یہ دونوں پہلو بیک وقت پائے جاتے ہیں یعنی اس کا قوت بخش ہونا اور اس کا خوش ذائقہ ہونا۔ اسی طرح رہن سہن کی تمام ضروریات کو پورا کرتے ہوئے انسان مجبور ہے کہ وہ ضرورت کے ساتھ ساتھ زینت کا اہتمام بھی کرے۔ ضرورتیں ہمیشہ یکساں ہیں لیکن زینت کا پہلو ارتقا پذیر ہے۔

زینت کا مفہوم بڑا وسیع ہے۔ روٹی کا گول ہونا، چارپائی کا چوکور ہونا، سالن میں مسالوں کا شامل ہونا، لباس کی قطع و برید اور اس کی سلائی (Tailoring) مکان کی دیواروں کی سپیدی، نہانے میں صابن کا استعمال، بالوں اور کپڑوں میں خوشبو ڈالنا، وغیرہ سب زینت و تفریح کے تقاضے ہیں۔ اس طرح کے تقاضوں کو زندگی کے دائرے میں ہم اپنی ضروریات سے الگ نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا کرنا چاہیں تو یہ انسانی فطرت کے خلاف ایک اعلان جنگ ہوگا، اور اس جنگ میں ہم اوّل قدم پر ہی شکست کھا جائیں گے۔

اب جن حضرات کو زینت و تفریح کے جائز تقاضوں کی اہمیت کا اندازہ نہیں، وہ جب ایک مسلمان کی زندگی کا نقشہ بناتے ہیں تو اسراف اور ضروریات دونوں کے نہایت غلط تصورات ذہن میں لے کر سوچنا شروع کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مجرد بنیادی ضروریات کو پورا کرنا حلال ہوتا ہے۔ اور اس سے آگے جو کچھ بھی ہے وہ اسراف کی تعریف میں داخل ہو کر حرام ہو جاتا ہے۔ ایسے حضرات جب انتہا پسندانہ تنقید کی نگاہ سے ناپ تول میں مشغول ہوتے ہیں تو کسی قمیض کے ساتھ کالر کا لگانا، کسی کے بدن پہ کوٹ کا موجود ہونا، کسی کے دسترخوان پہ سالن کے ساتھ اچار کا پایا جانا، کسی کا چائے پینا یا پان کھا لینا انہیں مسلمانی کا نقیض معلوم ہوتا ہے اور وہ اگر دوسروں میں یہ چیزیں پاتے ہیں تو ان کو مسرف شمار کرتے ہیں اور اگر خود اپنے آپ میں پاتے ہیں تو ان کے ضمیر پہ احساس گناہ کا بوجھ پڑ جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

حالانکہ زینت اور خوش ذوقی کے پہلوؤں کا انسانی زندگی میں جائز حد تک موجود ہونا اسلام کے خلاف نہیں ہے، بلکہ اسلام نے اس کا مطالبہ کیا ہے۔ مثلاً نبی صلعم نے اپنے ایک خوشحال صحابی کو پھٹے حال دیکھ کر اسے تاکید کی کہ اس کے رہن سہن سے اللہ کی دی ہوئی نعمت کا اظہار ہونا چاہیے، پھر آپ نے لوگوں کو یہ درس دیا کہ وہ بالوں کو پریشان رکھنے کے بجائے اُن میں تیل ڈالیں اور کنگھا کریں[1]، پھر آپ نے لوگوں کو تعلیم دی کہ وہ لباسوں اور بدنوں کو اجلا رکھیں، بلکہ ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ خوشبو لگانے کا اہتمام کریں۔ وغیرہ!

ان امور کو سامنے رکھنے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انسانی زندگی کو زینت و تفریح سے خالی کرنے کا مطالبہ محض خلافِ شریعت ہی نہیں، بلکہ درحقیقت یہ تحریف فی الدین ہے۔ وہ چیز جسے اللہ نے حرام نہیں ٹھیرایا، اسے حرام قرار دیتے ہوئے یا بدرجہ آخر مکروہ ٹھیراتے ہوئے آدمی کو کچھ تو خوف کرنا چاہیے۔ یہ بات تو اسی تعریف میں آتی ہے کہ "وان تقولوا علی اللہ مالا تعلمون" بلکہ یہ "قل من حرم زینۃ اللہ" کے جواب میں ایک پُر جسارت چیلنج ہے کہ ہاں اسے ہم حرام کرتے ہیں۔

ترکِ زینت کو بہ حیثیت اصول کے اگر اختیار کر لیا جائے اور مجرد ضرورت پر اکتفا کرنا انسانیت کے لیے شرعاً واجب ٹھیرایا جاتے تو ہمیں پھر اپنے دورِ وحشت کی طرف پلٹنا ہوگا اور تمدنی ترقی کے آگے رک بن کے کھڑے ہونا ہوگا۔ جو لوگ اس تجربہ کو کر دیکھنا چاہتے ہوں وہ کر دیکھیں، تمدن کی گاڑی اُن کے روکے تو کیا رکے گی، نہ خود اس کے پہیوں تلے پس جائیں گے!

۳۔ اوپر کی سطور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر ہم اسراف کا مفہوم متعین کرنا چاہیں تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ زندگی میں زینت و تفریح کے پہلو کا موجود ہونا لازماً اسراف کی تعریف میں نہیں آتا۔ لفظ اسراف کی باقاعدہ تحقیق اور بہ حیثیت اصطلاح اس کی تفصیل کرنے کے لیے تو زیادہ

---

[1] اگرچہ دوسری طرف آپ نے دن رات میک اپ کے شغلے میں مصروف رہنے سے بھی منع کیا ہے کیونکہ یہ دوسری انتہا ہے۔

فرصت کی ضرورت ہے۔ یہاں تو صرف ہم اپنے حاصلِ مطالعہ کو عرض کئے دیتے ہیں۔

اسراف انتہائی معصیت کبیرہ ہے۔ کتاب وسنت کے مطالعہ سے اس کی جو مختلف صورتیں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں:۔

ا۔ جن تفریحات اور دلچسپیوں کو شریعت نے منصوص احکام کے ذریعے حرام ٹھہرا دیا ہے اُن میں مال صرف کرنا قطعی طور پر اسراف ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص شراب نوشی، رقص وسرود جانداروں کی تصاویر اور مجسموں، مردانہ ریشمی لباس اور سونے کے مردانہ زیورات، سونے چاندی کے برتنوں، قسمت آزمائی کے کھیلوں، اور تفریحاً کتوں وغیرہ کے پالنے پر دولت وغیرہ کا کوئی حصّہ بھی صرف کرتا ہے تو یہ اسراف میں داخل ہے۔ یہ مصارف ایک شخص کو اخوان الشیاطین کی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں۔

ب۔ وہ تمام مصارف جن کا مقصود کسی جائز ضرورت کو پورا کرنے یا تحریک اسلامی خدا کے دین اور انسانی معاشرہ کی خدمت انجام دینے اور اس طرح رضائے الٰہی کو حاصل کرنے کے بجائے محض نام ونمود حاصل کرنا یا اپنی امارت کا ڈھنڈورہ پیٹنا اور کبر کا مظاہرہ کرنا ہو۔ یقیناً داخلِ اسراف ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مال صرف کرنے کی وہ تمام شکلیں جو ظاہراً انفاق فی سبیل اللہ کی سی ہوتی ہیں لیکن جن کی غرض ریاکاری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی، وہ اسراف سے بھی زیادہ موجب گرفت ہوں گی۔

خصوصاً زندگی کی دینی اور معاشرتی اور سیاسی تقریبات میں ٹھاٹھ باٹھ کا مظاہرہ کرنے کے لئے دولت کو آگ لگانا صرف اسراف ہی نہیں، بلکہ سوسائٹی میں تبلیغ اسراف کا ایک خطرناک ذریعہ ہے۔

ج۔ اوسط درجے کی ضروریات سے آگے بڑھ کر زندگی میں خواہ مخواہ کے تکلفات کو شامل کر کے اپنی آمدنی کی چادر سے پاؤں پھیلا کر مقروضیت کی حد تک جا پہنچنا بھی اسراف ہی کی تعریف میں آتا ہے۔

۵۔ زینت و تفریح فی نفسہ اگرچہ جائز ہے لیکن جائز تفریحات کا دائرہ بھی اگر اتنا زیادہ وسیع کر دیا جائے کہ ضروریات ثانوی اور اضافی حیثیت اختیار کر جائیں تو اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ صورت بھی اسراف ہی کہلائے گی۔ مثلاً شرعاً یہ جائز ہے کہ کبھی آپ کے دسترخوان پر ایک کے بجائے دو کھانے آجائیں، لیکن اگر دس دس کھانے پکنے لگیں اور کام و دھن کی لذت ایک ایسا مقصود بن جائے جس کے لیے خاص طور پر گوناگوں اہتمام کیے جانے لگیں یا مثلاً خادم رکھنے کے جواز سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نوکروں اور نوکرانیوں کے بیڑے بھرتی کر لیے جائیں تو یہ صورت قانوناً چاہے جائز ہو، اخلاقاً یہ بھی اسراف ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔

۶۔ کسی آدمی کا اپنی آمدنی کو اسطرح صرف کر دینا کہ اس میں سے صدقات واجبہ و نافلہ اقربا اور پڑوسیوں کے حقوق، اقامت دین کی جدوجہد اور نظام اسلامی کے استحکام کے مطالبات کی ادائی کے لیے کم وبیش کوئی گنجائش ہی نہ نکالی جا سکے تو ایسی زندگی از سرتاپا اسراف ہوگی چاہے اس میں تفریحات کا پہلو عیاشی کی حد تک بڑھا ہوا نہ ہو۔

اگر کسی شخص کی زندگی اسراف کی ان پانچوں صورتوں سے خالی ہو تو وہ ایک بہترین مسلمان ہو سکتا ہے ۔۔۔ اگرچہ اسے آپ چائے پیتے ہوئے یا پان کھاتے ہوئے یا کوئی اور تفریح کرتے ہوئے دیکھتے ہوں۔

۴۔ اسراف کے تصور کی طرح بہت سے لوگوں کے ذہن میں انفاق کے احکام کے تقاضوں کے بارے میں بھی بہت ہی غلط تصور کارفرما ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کے معنی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دورِ وحشت کا انسان جن چند بنیادی ضروریات پر اکتفا کیا کرتا تھا ایک مسلمان سچا مسلمان بننے کے لیے اس پر مجبور ہے کہ وہ بھی انہیں ضروریات تک اپنے مصارف کو محدود کر کے باقی سب کچھ راہِ خدا میں صرف کر دے۔ نیز جب تک انفاق فی سبیل اللہ کے لیے کوئی محل صرف موجود ہو، وہ کچھ پس انداز نہ کرے۔

اس معاملے میں بلاشبہ نبی صلعم نے اپنے عمل سے انفاق کا اتنا انتہائی معیار دنیا کے سامنے

رکھا ہے کہ اُس معیار تک اُس انسانِ کامل کے سوا شاید ہی کسی کی رسائی ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلعم کا انتہائی معیارِ انفاق ہر فرد کے لئے واجب نہیں ٹھہرایا گیا۔ بایں ہمہ نبی صلعم نے اچھے سے اچھے کھانے بھی کھائے ہیں اور بہ دیبائی تک کو زینتِ بدن بنایا ہے ___ درآنحالیکہ عرب کے ہر متنفس کو یہ سب کچھ حاصل نہیں تھا اور آپ نے اونٹ اور خچر کو سواری کے لئے اپنے استعمال میں رکھا ہے، جبکہ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ پوری عرب آبادی کی ضروریات پوری ہو رہی تھیں اور تحریکِ اسلامی کو مزید مالی اعانت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ علیٰ ہذا القیاس آپ خوشبویات استعمال فرماتے تھے اگرچہ ملک کا ہر فرد اس کی استطاعت نہیں رکھتا تھا۔

پھر مکہ کی ابتدائی مسلم سوسائٹی میں بعض اغنیا موجود تھے اور انہوں نے اگرچہ تحریک کی ضروریات اور مساکین اور مسافروں کی حاجات پوری کرنے کے لئے مال صرف کرنے کو اپنا شعار بنا لیا تھا لیکن اس کے باوجود ان کے پاس اثاثے تھے۔ اور پس انداز کردہ اموال بھی تھے۔ اور ان میں سے بعض کو یہ موقع بھی ملا کہ ہجرت کرتے ہوئے اپنے اموال کو بھی مدینہ لے گئے۔ یہ اثاثے اور اندوختے ہی تو تھے جو اضطراری حالات (EMERGENCY) میں کام آتے تھے، ورنہ اگر روز کی بچت ___ "العفو" ___ کو روز خرچ دینا لازم ہوتا تو نازک مواقع پر حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف سے اسلامی حکومت کو آخر بڑے بڑے چندے کہاں سے ملتے۔

بچتوں کی دو قسمیں ہیں، ایک بچت کرنا وہ ہوتا ہے جو کسی انسانی ضرورت کے لئے ہو۔ پھر بچت کرنا وہ ہوتا ہے جو محض مستقبل کی کسی ناگہانی ضرورت کیلئے ہو۔ بچت کی یہ دونوں صورتیں عام حالات میں جائز ہیں اور سوسائٹی کی معمولی ضروریات میں مناسب مالی امداد کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا سلسلہ جاری رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن جب نازک حالات پیدا ہو جائیں، یعنی جنگ، قحط یا عام مفلوک الحالی کا ایک وقتی طوفان اٹھ کھڑا ہو، جس کو فرو کرنے کے لئے حکومت اپنے سارے ذرائع و وسائل کو ناکافی پاتی ہو تو ایسے مواقع پر "العفو" کو صرف کر دینا لازم ہو جاتا ہے۔

پس یہ سمجھنا کہ کسی کے پاس "العفو" ہونا ہی نہیں چاہیئے، ورنہ انفاق کی ذمہ داری پوری نہیں ہو سکتی، غلط ہے۔

علاوہ بریں یہ نظریہ بھی اوسط درجے کے انسانوں کے لئے کبھی قابلِ عمل نہیں ہو سکتا کہ جب تک ایک آدمی بھی غذا، لباس، مکان اور معالجے سے محروم ہو کوئی شخص ان ضروریات کو ایک متوسط معیار پر پورا کرنے میں حق بجانب نہیں ہے، بلکہ اسے سب کچھ لٹا دینا چاہیئے۔ جب تک اہلِ حاجت موجود ہوں کوئی شخص پیٹ بھر کے کھانا نہ کھائے، مناسب لباس سے تن نہ ڈھانکے، اپنے رہنے کے لئے مکان نہ استعمال کرے، اپنی بیماری میں معالجہ کا انتظام نہ کرے، اپنے سفر کے لئے سواری سے کام نہ لے، اپنے اہل و عیال کی تعلیم پر مال صرف نہ کرے، بلکہ جو کچھ اسے میسر ہو، صدقہ کرتا چلا جائے۔ اس قسم کے نظریات آہستہ آہستہ لوگوں کو سرے سے اس بات ہی سے مایوس کر دیتے ہیں کہ وہ دین کے مطالبۂ انفاق کو پورا کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں لوگوں کو اگلے وقتوں کی کہانیاں معلوم ہوتی ہیں جن کو سن کر وہ جھوم تو سکتے ہیں، لیکن ان پر عمل کرنے کا عزم لے کے کبھی نہیں اُٹھ سکتے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ نبی صلعم نے اپنے صحابہ کو کئی مواقع پر اس امر کی تعلیم دی ہے کہ خدا کی راہ میں انفاق کرو، لیکن اپنے اہل و عیال کے حقوق ادا کرنے کے لئے مناسب حد تک مال باقی بھی رکھو۔ آپؐ نے یہ بھی واضح طور پر فرمایا ہے کہ صدقہ اس طرح نہ کیا جائے کہ آدمی ایک ہی بار انفاق کرے اور پھر خود سائلوں اور محروموں کی صفوں میں شامل ہو کر سوسائٹی کے لئے بار بن جائے۔ یہ حقیقت جس آیۂ قرآن سے اخذ ہوتی ہے وہ بھی آپ کے پیشِ نظر رہنی چاہیئے:

ولا تجعل يدك مغلولة الى عنقك	اور اپنے دستِ انفاق کو نہ تو (مارے بخل کے)
ولا تبسطها كل البسط ۔	گردن کے ساتھ باندھ لے، اور نہ اس کو یکسر
(پ ۱۵ - ع ۳)	کھول ہی دے!

پس انفاق بھی اعتدال کے ساتھ مطلوب ہے اور اسلام کا منشا یہ ہے کہ آدمی اپنی گوناگوں

ذمہ داریوں میں سے ہر ایک کا لحاظ کرے۔ نہ یہ کہ وہ ایک ہی طرف لڑھک جائے۔

۵ ۔ مندرجہ بالا مسائل کے متعلق بعض غلط فہمیاں ایسی ہیں جو خلافتِ راشدہ کے احوال و آثار کے غلط مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ درحقیقت خلفائے راشدین کے بارے میں سوانح نگاروں نے بھی معاشی حقائق کے کچھ پہلوؤں کو انتہا پسندانہ طریق سے ابھار کے پیش کیا ہے۔ کیونکہ یہ پہلو خاص طور پر سبق آموز تھے لیکن ان حقائق کے بعض دوسرے پہلوؤں کی وضاحت کما حقہٗ نہیں ہو سکی۔ پھر ستم یہ ہوا کہ ہمارے خطیبوں اور واعظوں نے بھی پورے زورِ کلام کے ساتھ یک رُخی باتیں بیان کی ہیں۔ چنانچہ اب حال یہ ہے کہ خلفائے راشدین اس خاکی دنیا کے انسان نظر نہیں آتے۔ اور دورِ حاضر کا ایک متوسط آدمی اپنے اندر اس بات کی ہمت ہی نہیں پاتا کہ وہ ان مقدس ہستیوں کے بنائے ہوئے راہِ عمل پر گام زن ہو سکے۔ آج لوگ اُن سے عقیدتیں وابستہ کرتے ہیں، لیکن ان کے سانچے میں ڈھلنے کو ناممکن خیال کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں یہاں بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ نبی کریم صلعم نے معاوضوں کے بارے میں جو اصولی ہدایت فرمائی ہے وہ یہ ہے:۔

من کان لنا عاملاً فلیکتسب زوجۃً وان لم یکن لہٗ مسکن فلیکتسب مسکناً، وان لم یکن لہٗ خادمٌ فلیکتسب خادماً، من اتخذ وراء ذالک فھو غالٌ او سارقٌ۔

جو کوئی ہماری حکومت کا کارکن ہو تو وہ بیوی فراہم کر سکتا ہے، اور اگر اس کے پاس مکان نہ ہو تو مکان حاصل کر سکتا ہے اور اگر اس کے پاس خادم نہ ہو تو وہ خادم بھی رکھ سکتا ہے، لیکن اس سے زیادہ جس کسی نے خزانۂ حکومت سے کچھ لیا وہ خائن ہے یا چور!

یہ روٹی کپڑے کے علاوہ وہ ضروریات ہیں جن کا صرفہ اسلامی حکومت کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اوسط درجے کے ایک معقول معاوضے کے اصول ہیں اور ان اصولوں پر جو معاوضہ دیا جا رہا ہو، اس میں صاف ستھری گذر ہو سکتی ہے۔ ان اصولوں سے یہ نہیں ٹپکتا کہ ملک

کے انتہائی غریب آدمی کے برابر یا تمدنی تقاضوں کا لحاظ کئے بغیر صرف بنیادی ضروریات کے مطابق انتہائی کم معاوضہ لیا جائے، کیونکہ نبی صلعم اپنے علاوہ بین حکومت کو خادم بھی فراہم کرتے ہیں۔

اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۱۰۰ روپیہ سے[1] کچھ کم ماہانہ معاوضہ لیا تھا ــــ حالانکہ عرب کے بیشمار بدووں کی ماہانہ آمدنی اس سے کم اور معیارِ زندگی اس سے پست تھا، اور ان میں وہ بھی تھے جن کی بنیادی ضروریات بھی خوش اسلوبی سے پوری نہ ہوتی تھیں۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے آپ کو "مالِ یتیم" کے والی کی حیثیت دیتے ہوئے انتہائی محتاط طریقے سے جو معاوضہ صحابہ کے مشورے سے طے کیا، وہ یہ تھا:۔

ا۔ سرکاری مصارف پر ایک سواری کا انتظام۔

ب۔ سردی گرمی کے لئے دو جوڑے کپڑوں کے۔

ج۔ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات کے لئے قبیلۂ قریش کے متوسط آدمیوں کے برابر معاش (جس کا اندازہ دو درہم یا ۱۰/، ۱۲/ روپیہ قرار پاتا ہے)۔

یہ ظاہر ہے کہ قبیلۂ قریش عام عرب کے مقابلے میں مالدار اور خوش حال تھا اور اس کا معیارِ زندگی نسبتہً بہتر تھا۔ پھر اس قبیلے میں سے بھی آپ نے نہ تو چوٹی کے امراء کے معیار کو سامنے رکھا اور نہ دوسری طرف بالکل نیچے کے غرباء کے معیار کو، بلکہ متوسط طبقے کے معیار کو اپنے لئے پسند کیا۔

یہ حقیقت بجائے خود قابلِ لحاظ ہے کہ اُس دور میں عربی آبادی کا مجموعی معیارِ زندگی اتنا پست

---

[1] یہ خلیفۂ اول کے تقویٰ کی انتہا تھی کہ آپ نے مرتے وقت وہ ساری رقم بیت المال میں داخل کرنے کی وصیت کی جو آپ نے بطورِ معاوضہ وصول کی تھی، لیکن آپ کا یہ ایثار اس کی دلیل نہیں ہے کہ بیت المال سے کارکنانِ حکومت کے لئے کچھ لینا ناجائز ہے۔

تھا کہ اُس کا کوئی تصور آج ہم کر ہی نہیں سکتے۔ یہاں تک کہ قریش کے خوشحال ترین قبیلے کا متوسط طبقہ بھی آج کے غریب طبقے سے بہتر نہ تھا۔

تاہم خلفائے راشدین کے اسوہ سے جو قابلِ اتباع روایات سامنے آتی ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سرکاری کارکنوں کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے جو معاوضے دیئے جائیں وہ ہر دور کے اوسط درجے کے معیارِ زندگی کے مطابق ہونے چاہئیں۔

یہ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت حالات ایسے ہوں کہ اسلامی تحریک یا اسلامی حکومت کے کارکنوں کو اپنی خدمات بالکل بلا معاوضہ پیش کرنی پڑیں اور اپنی ضروریات کے لئے الگ سے محنت کرنی پڑے۔ .... لیکن اس قسم کے حالات عارضی ہوتے ہیں اور بیت المال میں جوں جوں فراخی آئے گی، کارکنانِ اسلام کو ضروری حد تک معقول معاوضے ملنے لگیں گے۔ چنانچہ تاریخ سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ اسلامی ریاست کے مالی حالات جتنے جتنے بہتر ہوتے گئے، کارکنوں کے وظائف میں مسلسل اضافے ہوتے رہے۔

ب۔ خلفائے راشدین کے دور میں چونکہ مستقبل کے لئے روایات قائم ہو رہی تھیں اور عملی نظائر (Precedents) وجود میں آرہے تھے، اس لئے بیت المال میں تصرّف کرنے میں انتہائی احتیاط برتی گئی، یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اہل بیت نے جب سرکاری وظیفہ میں سے ایک اچھا کھانا پکانے کے لئے بچت کر دکھائی تو آپ نے اُس بچت کے بقدر اپنے معاوضے میں کمی کر دی۔ دوسری طرف حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہد کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ بیت المال میں شہد موجود ہے تو وہ از خود اس میں تصرّف نہیں کرتے، بلکہ اپنے رفقاء سے مشورہ لیتے اور اجازت طلب کرتے ہیں۔

یہ احتیاطیں اس مقصد کے لئے تھیں کہ بیت المال کے امانت ہونے کا تصور مستحکم ہو جائے اور اس میں آزادانہ تصرّف کرنے سے لوگ باز رہیں۔ بیت المال سے استفادہ کرنے کا کوئی ضابطہ ہو اور ذمہ دارانہ پن کے گہرے احساس سے کام لیا جائے۔

پس اب خلفاء راشدین نے نبی صلعم کی ہدایات کی روشنی میں بیت المال میں تصرف کرنے اور معاوضہ بندی کرنے کے بارے میں جو اصولی اسوہ قائم کر دیا ہے۔ اُس کا اہتمام تو ہر دور میں کیا جائے گا۔ لیکن اگر بیت المال کے معاوضے اور اسلامی حکومت کی تنخواہ کے بارے میں انتہائی حساسیت سے کام لیا جائے۔ اور معروف کے مطابق اوسط درجے کو استعمال کرتے ہوئے بھی آدمی کا ضمیر بار محسوس کرنے لگے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ سرکاری بیت المال سے تنخواہ لے کر کام کرنے پر کوئی متقی انسان تیار ہی نہ ہو سکے گا۔ خود دورِ فاروقی میں یہی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ بعض صحابہ نے اسلامی حکومت کی بالمعاوضہ خدمت سے انکار کر دیا تھا، لیکن حضرت عمرؓ نے انہیں مجبور کیا کہ وہ معاوضہ لے کر کام کریں، چاہے وہ غنی ہی کیوں نہ ہوں۔

ج۔ یہ بلا شبہ صحیح ہے کہ اسلامی حکومت میں امیرِ مملکت Head of the state کی ذمہ داری تمام کارکنانِ حکومت کے مقابلہ میں ممتاز قسم کی ہے۔ وہ اپنے معاوضے کے بارے میں تو انتہا احتیاط برتے گا۔ لیکن عام کارکنانِ حکومت کے لئے سہولت کی گذر کا اہتمام کرنا اس کے لئے واجب ہے، تاکہ ان کی کارکردگی (Efficiency) کا معیار بلند رہ سکے، نیز بد دیانتی (Corruption) کے لئے کوئی معاشی وجوہ پیدا نہ ہونے پائیں یہی مسلک خلفاءِ راشدین کا تھا۔ انہوں نے خود تو کم سے کم حد تک معاوضے لئے ہیں۔ لیکن اپنے نائبوں، ججوں سپاہیوں میں جائز حد تک نہایت معقول معاوضے اور وظائف تقسیم کئے ہیں۔

دراصل بیت المال کو "مالِ یتیم" کی حیثیت دے کر اپنے آپ کو اس کا متولی محسوس کرنا صرف امیرِ مملکت کا مقام ہے۔ رہے اس کے دوسرے ماتحت کارکن اور عام ملازم سو وہ براہِ راست مالِ یتیم کے متولی نہیں ہوتے، بلکہ ان کی حیثیت ویسی ہوتی ہے جیسی ان کارکنوں کی ہوتی ہے۔ جنہیں کسی یتیم کا متولی یتیم کی جائداد کو سنبھالنے اور اس کو نفع بخش بنانے کے لئے ملازم رکھتا ہے۔ ان ملازمین کو وہ ان کی صلاحیتوں اور خدمات کے مطابق درجہ بدرجہ معیارِ مروّج کو پیشِ نظر رکھ کر معاوضے دے گا۔

د۔ کسی نازک صورت حالات (EMERGENCY) کے پیدا ہو جانے کی صورت میں امیرِ مملکت کی ذمہ داریاں انتہائی طور پر نازک ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اگر جنگ و وبا یا قحط وغیرہ کی وجہ سے عوام مصائب میں مبتلا ہو جائیں اور مصائب کے ازالہ کے لئے ملک کی ساری قوت کو ایک طرف متوجہ کرنا پڑے تو امارت کا سکون تہ و بالا ہو جائیگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وقت کا حکمران رعایا کی تمام مشکلات کے بارے میں براہِ راست خدا اور خلق دونوں کے سامنے جواب دہ ہے۔

ایسے خاص حالات میں چونکہ حکومت کے ذرائع و وسائل کی کوتاہی کو پورا کرنے کے لئے شہریوں سے پورا تعاون حاصل کئے بغیر کام نہیں چل سکتا، لہٰذا امیرِ مملکت مجبور ہوتا ہے کہ وہ بچت اور ایثار کی عام اپیل کرے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ مسرفین کی زبان سے بچت کی اور منترفین کی زبان سے ایثار کی اپیلیں سُن کر دنیا نے کبھی اثر نہیں لیا۔ اور قول و فعل کا تضاد عوام میں کبھی صالح جذبات کو نہیں ابھار سکتا، اس وجہ سے ایک اسلامی مملکت کا سربراہ کار دوسروں سے اپیل کرنے سے پہلے اپنے عمل کو دوسروں کے لئے نمونہ بناتا ہے[1]۔ یہی صورت تھی جب کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے قحط چھا جانے پر گیہوں کی روٹی، گوشت، روغن زیتون اور گھی کھانا چھوڑ دیا تھا۔ اور اس وقت تک عوام کے ساتھ مل کر فاقہ کشی کی۔ جب تک پورے ملک کو مناسب غذا فراہم نہ ہونے لگی۔

---

[1] آج حال یہ ہے کہ امرائے مملکت عوام سے قومی ضروریات کیلئے بچت کی اپیلیں کرتے ہوئے اپنی کئی کئی ہزار روپوں کی تنخواہوں میں سے قوم کے لئے کچھ بھی پس انداز نہیں کرتے۔ یہ غریبوں سے چندے طلب کرنے نکلتے ہیں لیکن اپنی جیب سے اپنی استطاعت کے مطابق کبھی کسی فنڈ کے لئے چندہ نکالنے کا موقع انہیں کم ہی پیش آتا ہے۔ یہ قحط میں کم غذا پر اکتفا کرنے کا وعظ کہنے گھر سے نکلیں گے تو توس مکھن کھا کے نکلیں گے۔ یہ اگر دوسروں کو ملک کے نازک حالات کا واسطہ دلا کر اتحاد کی تلقین کریں گے۔ تو خود آپس میں عہدوں کے لئے کش مکش کو اور زیادہ تیز تر کر دیں گے۔ یہاں پر عمل کا وعظ بے عملی کی زبان سے کہا جاتا ہے۔

بعض لوگوں نے خاص حالات کے اس طرزِ عمل کو ہر قسم کے حالات کے لئے لازم سمجھ لیا ہے، حالانکہ تاریخ اس کی گواہی نہیں دیتی۔ اس قسم کے حالات جب کبھی آجائیں تو ان کے تقاضوں کے مطابق حکومت کے سربراہ کاروں کو عوام کے مصائب میں شریک ہونا ہوتا ہے، لیکن عام حالات میں یہ کوئی اصول نہیں کہ امیرِ مملکت یا کارکنانِ حکومت کی زندگی ہر لحاظ سے اُس معیار پر رہے جس پر مملکت کے غریب ترین افراد کی زندگیاں ہوں۔

۲۔ تنخواہوں اور معاوضوں کے بارے میں اصول اگرچہ ہر دور میں ایک ہی رہیں گے۔ مگر ہر تمدنی دور اور ہر ملک کے معیارِ زندگی کے لحاظ سے اُن اصولوں کی عملی تفسیر میں ایک گونہ فرق ہوگا مثلاً خلیفۂ دوم اپنے دور کے متوسط طبقے کے معیار کو پیشِ نظر رکھتے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسی دور کے قریش کے اوسط آدمی کے معیار کو آج کے دور میں بھی پیش نظر رکھا جائے۔ بلکہ آج تو آج ہی کے متوسط درجے کو پیش نظر رکھا جائیگا ــــــ حالانکہ آج کے دور کا اوسط معیار تیرہ سو سال پہلے کے قبیلہ قریش کے اعلیٰ معیار سے لگا کھاتا ہے، بلکہ بعض پہلوؤں سے تو یہ بڑھا چڑھا ہے۔ پھر فرض کیجیئے کہ اگر آج برٹش اور امریکن قومیں اسلام کو اپنا نظام حیات بنا لیں تو ان کے کارکنان حکومت کے معاوضے ان کے اپنے تہذیب و تمدن کے لحاظ سے معیار اوسط کے مطابق ہونگے، نہ یہ کہ آپ اُن سے مطالبہ کریں کہ اپنے آپ کو قبیلۂ قریش کے سوا ہزار سال قبل کے معیار پر لاؤ۔ آج کون روغن زیتون کے چراغ چلائے گا۔ آج کون کھجور کی گٹھلیوں سے بنے ہوئے ستو کھائے گا؟ آج کون اونٹ کے بالوں کے خیمے لگا کے رہے گا اور آج کون کھجور کے پتوں کے چپل پہنے گا؟ ــــــ آج آپ اپنی سوسائٹی کے ایک ادنیٰ ترین فرد کے گھر جا کے اس کے برتنوں اور سامانوں کی فہرست بنائیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ نیا تمدن کتنے نئے لوازم در آمد کر چکا ہے۔ ان لوازم کو ختم کرنا اگر ممکن ہے تو صرف رہبانیت سے ممکن ہے، لیکن رہبانیت کبھی ایک نظامِ حکومت کو چلانے کے قابل نہیں ہوتی۔

تمدن معاوضوں کے معیار پر بہت گہرا اثر ڈالتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے سواری کے لئے

اونٹ طلب کیا تھا۔ لیکن آج اگر حضرت عمرؓ ہی کو اسلامی حکومت کی ذمہ داری سنبھالنی ہو تو وہ موٹر کار اور ہوائی جہاز کے بغیر ایک بڑی سلطنت نہ چلا سکیں گے۔ اسی طرح حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کوئی دفتر نہیں تھا، لیکن آج اگر وہ زندہ ہوں اور پاکستان کے امیر مملکت بنائے جائیں تو ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ وہ پورے لوازم کے ساتھ ایک دفتر آراستہ کرائیں اور ان کے ساتھ ایک وسیع سیکرٹری ایٹ برسرِ عمل ہو۔[1]

۶۔ آپ کے سارے سوالات کا اصل محور کتے پالنے اور اُن کے اکھاڑے منعقد کرنے کے جواز و عدم جواز کا مسئلہ ہے۔ آپ کی تحریر سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ یا تو کتوں کو پالنے اور ان کو دودھ، گھی، حلوا پوری کھلانے اور ان کی دوڑوں کے مقابلوں وغیرہ کو جائز قرار دیا جائے۔ ورنہ پھر کوئی تفریح اور کوئی سامانِ زینت جائز شمار نہیں ہونا چاہیئے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اونٹ، گھوڑے، بھینس، بکری اور بلی پالنے کے مقابلے میں کتے پالنے کا معاملہ بالکل جداگانہ قسم کا ہے۔ اول الذکر میں سے کچھ کے متعلق قرآن میں یہ وارد ہے کہ "لترکبوھا وزینۃ"۔ یعنی تم ان پر سواری کرو اور وہ تمہارے لئے سامانِ زینت ہوں پھر کچھ کے متعلق ایک طرف فرمایا کہ:۔

جعل لکم من جلود الانعام بیوتا	اللہ نے چوپایوں کی کھالوں سے تمہارے لئے خیمے فراہم کئے۔

---

[1] تمدنی ارتقا کا لحاظ کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کارکنانِ حکومت کو عیاشی کے سامان فراہم کرنے کی ذمہ داری بھی حکومت کے بیت المال پر عائد ہوتی ہے۔ نہ تمدنی ارتقاء کی آڑ لے کر معاوضوں کو اس مسرفانہ حد تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ کہ ایک آدمی اپنے لئے ہی نہیں، اپنی اولاد کے لئے بھی خزانہ ہائے گراں بہا سمیٹ لے اور جائدادیں بنائے —— آج اکابرِ حکومت کے لئے جس طرح کے معاوضے اور الاؤنس رائج ہیں وہ جائز حدود سے بہت آگے نکل چکے ہیں اور ان کی وجہ سے لاکھوں کارکنانِ حکومت اور ملک کے کروڑوں شہریوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہ سب کچھ اصلاح طلب ہی نہیں انقلاب طلب ہے!

پھر فرمایا کہ:-

ومن اصوافها واوبارها واشعارها اثاثاً ومتاعاً الی حین۔	اور ان کی اُون سے، اور ان کی پشم سے، اور ان کے بالوں سے۔ تمہارے لئے استعمالی اسباب فراہم کئے ہیں۔

پھر فرمایا کہ:-

ومن الانعام حمولةً وفرشاً۔	اور چوپایوں میں سے بعض لدو ہیں اور بعض مذبح میں پچھاڑے جانے والے ہیں۔

اس طرح کے مختلف فوائد کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ساتھ دوسری طرف "زینت" کے پہلو پر توجہ دلائی کہ:-

ولکم فیھا جمالٌ حین تریحون وحین تسرحون۔	اور تمہارے لئے ان کا منظر خوش آئند ہوتا ہے اُس وقت بھی جب تم انہیں (چرانے کے بعد) لوٹا کے گھر لاتے ہو اور اس وقت بھی جب انہیں گھروں سے لے کے نکلتے ہو۔

یہ "افادیت" اور "جمال" جس کا تذکرہ قرآن نے کیا ہے۔ اسے کسی ایک موقع پر بھی کتوں سے نسبت نہیں دی، بلکہ کتوں کے پالنے کو شریعت اسلامی نے ناپسند (Dis-courage) کیا ہے۔ حدیث میں تصریح سے وارد ہے کہ ایسے گھر میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے جس گھر میں (بلا کسی اشد ضرورت کے) کتے پالے گئے ہوں۔ اس کے وجوہ بھی واضح ہیں۔ ایک مسلمان جس کا گھر سوشل روابط کا مرکز ہونا چاہئے، اس میں لوگوں کا بے کھٹکے آنا جانا ممکن نہیں رہتا، دوسرے یہ کہ کتے پالنے والے گھروں میں برتنوں اور لباس کی طہارت کو اسلامی معیار پر قائم رکھنا نسبتہً زیادہ مشکل ہو جاتا ہے اور اکل و شرب میں کراہت اور عبادات میں خلل پیدا ہونے کے وجوہ موجود رہتے ہیں۔

اس وعید کے ساتھ ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی تمدن کی حقیقی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دو حالتوں میں کتے پالنے کی رخصت دی ہے - ایک اس لئے کہ گھر کی حفاظت کے لئے یہ انتظام کرنا ناگزیر ہو، دوسرے کسی کی گذر بسر کا دار و مدار جن ذرائع پر ہو، شکار بھی ان بھی ان میں سے ایک ہو۔ علیٰ ہٰذا القیاس سراغ رسانی یا عضویاتی اور نفسیاتی تحقیق وغیرہ ضروریات کے لئے ایک حکومت کتوں کے لئے خاص پرورش گاہیں بھی کھول سکتی ہے۔

ان رخصتوں کے علاوہ عام حالات میں کتے پالنے کا معاملہ ویسا نہیں ہے جیسے گھوڑے اور گائے بکری پالنے کا معاملہ ہے - پھر اگر ضرورۃً کتوں کو پالنے کی رخصت سے کسی کو فائدہ اٹھانے کی ضرورت پیش ہی آئے تو یہ "مشغلۂ لطیف" اس انتہا تک بھی نہ جا پہنچنا چاہئے کہ کتّے کو انسانی ذوق کے اونچے تقاضوں کے مطابق ایسی غذائیں کھلائی جائیں، ان کے لئے وہ ریشمی بستر فراہم کئے جائیں، اور ان کے لئے ملازم رکھنے پر اتنا صرف کیا جائے جتنا کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ، بیوی بچوں اور ذوی القربا اور احباب اور پڑوسیوں کے لئے بھی نہیں کرتا۔ کتا پالئے تو کتے کو کتے کی طرح پالئے، اسے پالک نہ بنا لیجئے۔

پھر کتے پالنے کو ایک ضرورت کے طور پر نہیں، بلکہ مشغلے (Hobby) کے طور پر اختیار کرنا اور اس مشغلے کو فروغ دینے اور اس سے دلچسپی بڑھانے کے لئے کتوں کے میلے اور جلسے اور انعامی مقابلے منعقد کرنا ایک اسلامی معاشرہ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اس قسم کے اکھاڑوں پر ہزاروں روپیہ لٹا دینا لہو و لعب کی ایک مکروہ صورت ہے۔ خصوصاً اس طرح کی سرگرمیوں کی سرپرستی اگر ایک ایسی حکومت اور اس کے ذمہ دار افسر کرنے لگیں جو اپنے سامنے اسلامی نظام کو استوار کرنے اور اسلامی ماحول تعمیر کرنے کا گراں بہا نصب العین رکھ چکے ہوں، بہت ہی حوصلہ فرسا حرکت ہے - یہ نصب العین تو اتنا بھاری اور اتنا وسیع ہے کہ اس سے وقت اور مال بچانے کا موقع ایک دیانت دار حکومت کو مل ہی نہیں سکتا۔

یہ ہے وہ بات جسے ہم کہتے ہیں لیکن اس پر اگر کوئی یہ کہے کہ یا تو کتوں کے میلوں اور مقابلوں

کو ایک جائز تفریح مانو ورنہ زندگی میں تفریح کا کوئی پہلو بھی باقی نہ رہنے دو، تو اس کے استدلال کا کوئی جواب دینا مشکل ہوگا۔

توقع ہے کہ آپ اگر ترتیب وار اوپر کے سارے اشارات پر متوازن دماغ کے ساتھ پوری طرح غور و فکر فرمائیں گے تو آپ کے ذہن کی بہت سی گرہیں کھل جائیں گی۔

ضروری اعلان

رسالہ ترجمان القرآن کے پرچے

از

شعبان سنہ ٦٦ھ تا ذی قعدہ سنہ ٦٧ھ

چار ماہ کے مسلسل اور اس کے بعد رجب

سنہ ٦٨ھ و محرم سنہ ٦٩ھ تا جمادی الاول

سنہ ٦٩ھ دفتر میں موجود ہیں۔

جو حضرات خریدنا چاہیں وہ آٹھ آنے فی پرچہ

کے حساب سے خرید سکتے ہیں

اگر بارہ ماہ کے اکٹھے پرچے خرید کرنا چاہیں تو

پانچ روپے میں خرید سکتے ہیں۔

مینجر رسالہ ترجمان القرآن

اچھرہ لاہور